

زندگی اور علم النفسیات

از جناب سید منی الدین، صاحب شمسِ ایم لے

انسانی زندگی کیا ہے؟ اور کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ ان سوالات کے جواب میں ہی سمجھا جاتا ہے کہ ہم اس دنیا میں سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہیں تو ہم زندہ کہلاتے ہیں۔ پھر جب سانس آنا بند ہو جاتا ہے اور مرغِ روح قصِ غصری سے پرواز کر جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کس نظم اور کس اصول کے ماتحت پیش آتے ہیں؟ تو اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے ساتھ اپنی قسمت بھی لاتا ہے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے وہی ہوتا ہے اور جب وہ لکھا پورا ہو جاتا ہے تو وہ اس دنیا سے رخصت سفرِ بانڈھ کر عالمِ آخرت کو سدھار جاتا ہے۔

آئیے! اب ذرا غور و تعلق کے ساتھ زندگی پر نظر ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج فلسفہ و سائنس نے کائنات کی ہر چیز کی نسبت معلومات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ عالمِ طبعیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں عصرِ حاضر کے فلک پیمانہ انسان نے پہنچنے اور اس کی حقیقت و ماہیت کے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس ذوقِ تحقیق و جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اپنے ماحول اور گرد و پیش کی طرح خود اپنی ذات سے متعلق بھی بہ نسبت سابق کہیں زیادہ باخبر اور واقف ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جدید انکشافات جس طرح ہمارے علم میں بیش قیمت اضافہ کا باعث ہوئے ہیں ساسی طرح یہ انکشافات اس حقیقت کی بھی غمازی کر رہے ہیں کہ ہم اب بھی کتنے ناواقف ہیں اور ابھی ہمیں کتنا اور واقف ہونا ہے سائنس اور علومِ جدیدہ سب کچھ بتانے کے بعد بھی اب تک ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی ہم کہاں سے آ رہے ہیں!

اور کہاں جا رہے ہیں؟ یہ سوالات فلسفہ اور سائنس کے ناخن کے لئے اب تک عقدہ بے لایمحل ہی بنے ہوئے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ زندگی اس چڑیا کی سی اڑان ہے جو اندھیرے سے نکل کر ایک روشن کمرہ میں آتی ہے اور پھر اس کمرہ سے نکل کر اندھیرے میں ہی چلی جاتی ہے۔ ان دونوں اندھیروں کا درمیانی وقفہ کتنے عجائبات کا حامل ہوتا ہے؟ اس وقفہ میں ہم پر کیا کچھ نہیں گذر جاتا؟ مسرت و غم، تکلیف و راحت اور زندگی اور بیماری سب ہی کچھ اس مختصر سے وقفہ میں پیش آتا ہے۔ گویا زندگی ایک بزن ہے جو ہمیشہ بھرا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کا پانی لمحہ بلکہ اور ساعت بر ساعت حوادث و واقعات کے زیر اثر نئے نئے رنگ قبول کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ بے کیف ہوتا ہے تو کبھی نہیں۔

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں خالی ہر جام اور پئے جا رہا ہوں میں
اور کبھی مناظرِ فطرت کی رنگینیاں اس کے ذوقِ نشاطِ اندوزی کو مخمور و سرشار کر دیتی
ہیں تو وہ گنگنائے لگتا ہے۔

بخشنے ہے جلوہ گلِ ذوقِ تاشاغالب چشم کو چاہئے ہر رنگ میں واہو جانا
تاریخِ انسانی میں مسئلہ جبر و قدر کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اندھی قسمت کے قائل
اب بھی موجود ہیں۔ یہ اعتقاد زندگی کو محض ایک ہوا بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ایک جوار ی کی
مانند زندگی سے کھیلتے ہیں۔ دوسروں کی خوش قسمتی پر رشک کرنا اور اپنی بد نصیبی پر بے بس اور مجبور
و ناچار کی مانند نوحہ و ماتم کرنا زندگی کے جوہر کو فنا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمل و
حکمت کے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور قدرت نے ہم میں جو صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کی ہیں انہیں
مفلوج و بے کار کر دیتے ہیں جو شخص صرف زندہ رہنے کے لئے زندہ ہے اور وہ زندگی کے اصل
مقصد پر غور نہیں کرتا اس کے لئے زندگی کی حقیقی مسرت و شادمانی سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے،
عام لوگوں کے لئے انسانی زندگی کا مسئلہ صرف ایک ذاتی اور داخلی حیثیت رکھتا ہے
لیکن سائنس داں اور فلسفی کائنات میں انسان کے وجود کو خواہ کتنا ہی حقیر اور غیر اہم سمجھے تاہم وہ
اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی افراد میں سے ہر فرد بجائے خود ایک عالمِ صنیر ہے اور اس کو

کائنات کی دوسری اشارے سے اگر دلچسپی ہے اور وہ ان کا علم حاصل کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر انسان کے آنکھ نہ ہوتی تو سورج چاند اور ستارے سب اس کے لئے بے معنی ہوتے۔ اگر اس میں سونگھنے کی قوت نہ ہوتی تو بڑے سے بڑا خوشبودار پھول بھی اس کے لئے بے حقیقت ہوتا۔ اگر اس میں لمس کا احساس نہ ہوتا تو سرفلک پہاڑوں کی چٹانیں بھی اس کے دل میں خوف و ہراس کی کوئی کیفیت پیدا نہ کر سکتیں اگر اس میں چکھنے کی قوت نہ ہوتی تو امرت اور اپ جیات، اور زہر بلاہل و خظل دونوں اس کے لئے یکساں ہوتے۔ اگر اس کے پہلو میں دل نہ ہوتا تو نشاط و غم اور مسرت و الم ان دونوں میں وہ کوئی فرق نہ کر سکتا۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ کائنات کا مرکز اور تمام رازوں کا مآزبہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کی نمود و نمائش انسانی زندگی کی بظلمونی اور گونا گونی سے وابستہ ہے۔

”بوسے گل بھیلتی کس طرح جو ہوتی یہ نسیم“

اس مرحلہ پر پہنچ کر قدرتی طور پر ہمارے سامنے تین سوالات آتے ہیں۔

(۱) کائناتِ عالم میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟

(۲) انسان کی تخلیق کا کائنات سے کیا تعلق ہے؟

(۳) انسان کو اپنی زندگی کن اصول پر بسر کرنی چاہئے اور نیز یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے

ہمارے پاس ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے کے چار ذرائع موجود ہیں یعنی مذہب

سائنس، فلسفہ اور نفسیات۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد متعین

کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے یہ چاروں چیزیں بیکر ضروری ہیں

کوئی شخص ان کی رہنمائی کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

مذہب | ان چاروں چیزوں میں سے پہلے مذہب کو لیجئے۔ مذہب ہماری زندگی کا مقصد متعین

کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم خدا کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ہر مذہب اس کا اعلان کرتا ہے

لیکن اسلام نے جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ اس مقصد کو سمجھایا ہے کسی اور نے نہیں سمجھایا۔ وہ اس مقصد کی تشریح اس وسعت کے ساتھ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اور حیاتِ انسانی کا ہر شعبہ معتدل ہو کر اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ اس بنا پر اس کو حکمتِ نظری و عملی سے آراستہ ہو کر بساطِ ہستی پر حق و انصاف کا پرچم لہرانا چاہئے اور ظلم و جور، بد اخلاقی اور گنہگاری کا استیصال کر دینا چاہئے۔ اقبال مرحوم نے اس ہی حقیقتِ کبریٰ کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

یقین پیدا کرے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس تعلیم و تلقین سے جہاں انسانی زندگی کا مقصد متعین ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام کائناتِ عالم میں انسان کا مقام کس قدر اونچا ہے ایک روایت میں انسان کو "بنیانِ رب" کہا گیا ہے اور پھر فرمایا گیا کہ جو شخص کسی انسان کو بے گناہ قتل کرتا ہے وہ اس طرح گویا بنیانِ رب کو ہی منہدم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا نصب العین اور کائنات میں انسان کی حیثیت متعین کرنے کے بعد مذہبِ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی کے لئے خاص خاص احکام کی تعلیم دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر ایک انسان اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ موت اور عالمِ مابعد الموت کے کٹھن منازل کے متعلق بھی وہ خاص قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور اس طرح زندگی اور اس کی ابتدا و انتہا ہر ایک چیز پر روشنی ڈالتا ہے۔ مذہب کی اس رہنمائی کا تعلق انسانی اعتقاد و یقین سے ہے۔ یعنی وہی شخص اس ذریعہ سے اطمینان و سکون حاصل کر سکتا ہے جو مذہب کی سچائی کا یقینِ کامل رکھتا ہو اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہو۔ ورنہ مذہبی احکام سے انحراف کا احساس ہمیشہ اس کے دل میں گنہگاری کی خلش پیدا کرتا رہے گا اور وہ اطمینان سے محروم ہو جائیگا۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ میں حیاتِ انسانی پر مذہب کا

ہمیشہ بہت گہرا اور پائیدار اثر رہا ہے۔

سائنس اس کے برخلاف اس سائنس داں کو لیتے جسے حق کی تلاش ہے، یہ خاص قسم کے حقائقِ قدرت کے مشاہدے اور ان کا تجزیہ و تجربہ کرنے کے بعد ان کو مرتب کر کے قوانینِ قدرت کے استنباط میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اس کے لئے زندگی کے تمام مسائل کا دریافت کر لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاہم جب وہ اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو جو کچھ اسے معلوم ہو سکتا آتے جانے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر جیمس جین (Sir James Jean) جو ایک بلند پایہ سائنس داں ہے۔ کہتا ہے کہ "کائنات کے انتہائی راز دریافت کرنا سائنس کے حدود سے خارج ہے۔ اہر شاید انسانی ذہن انہیں کبھی سمجھ بھی نہیں سکے گا" سائنس نے اب تک جو کچھ معلوم کیا ہے وہ معمولی سمجھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے حدودِ معلومات سے باہر ہے تاہم سائنس کے کارناموں نے تمدنی اور اجتماعی اعتبار سے جو اثر عوام و خواص کی ذہنیت اور ان کے امیال و عواطف پر کیا ہے وہ معمولی نہیں ہے اور اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

صدہا سال تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ سورج اور چاند اور دوسرے سیارے (Planets) زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ گویا ہماری زمین کائنات کا مرکز ہے لیکن کوپرنیکس (Copernicus) کے غور و فکر نے یہ ثابت کیا کہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں لگاتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد تمام دنیا کو اپنے خیال میں رد و بدل کرنا پڑا اور اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ ہماری زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ آسمان میں سورج ایسے اور بڑے بڑے عظیم الشان سیارے موجود ہیں جن کے مقابلہ میں زمین ایک رائی کے دانہ کی برابری محبت رکھتی ہے، اس نظریہ کے اعلان نے انسان کو جو "سچو من دیگرے نیست" کا تقارہ بجاتا چلا آیا تھا چوکنا کر دیا اور اس نے پہلے پہل خود فریبی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے جو جو جتن کئے اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ یہ بھی تھا کہ غریب گلیلو (Galileo) کو سزائے موت کا حکم سننا پڑا۔

کئی صدیوں تک سائنس داں کائنات کو محض اندھی طاقتوں کا ایک کھیل سمجھتے رہے

ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس زبردست میکانیکی شین کے تمام میکانیکی اصول سمجھ گئے ہیں اور یہ ویسٹ انجین میکانیکی اصول پر چل رہی ہے۔ اس غور و فکر پر جس تمدن کی بنیاد رکھی گئی اس کا مادی ہونا لازمی امر تھا لیکن آج کل کے سائنس دان اس تشریح کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود سائنس دانوں نے ہی مادیت کے پر نچے اڑا دیئے ہیں۔ چنانچہ سائنس نے مادہ کا تجربہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ کسی شے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ مادہ کی آخری تقسیم ہے جس سے مادہ مرتب ہوتا ہے۔ جب اس چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو بھی توڑ ڈالا گیا تو یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ مادہ کی آخری تقسیم جزیرہ لائیجری ہے اور مادی دنیا بجائے چار کے سو سے زائد عناصر سے مرکب ہے۔

پھر یہ انکشاف ہوا کہ مادہ کی یہ تقسیم بھی انتہائی تقسیم نہیں ہے اگرچہ مادہ ان اجزائے لائیجری سے مرکب ہوتا ہے لیکن ان اجزائی ترتیب آپس میں گتھی ہوئی اور باقاعدہ نہیں ہوتی۔ نیز جزیرہ لائیجری کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے بلکہ ہر جز کو ایک نہایت چھوٹا سا نظام شمسی سمجھنا چاہئے جس طرح سورج کے گرد زمین، چاند اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح جزیرہ لائیجری کے ذروں میں سے ایک ذرہ مرکز ہوتا ہے اور دوسرے ذرے اس مرکز کے گرد لائٹا ہی طور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ اب یہاں قابل غور یہ بات ہے کہ ہم نے جب آخری تقسیم کو جزیرہ لائیجری مان لیا تو اب اس کے ذرے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ان کو ذرہ کہنا ہی غلط ہوگا۔ ان ذروں کو سائنس کی اصطلاح میں الیکٹرون (Electron) یعنی برقیہ کہتے ہیں اور انھیں ذروں کا مرکز پروٹون (Proton) کہلاتا ہے اس مرکزی ذرہ میں مثبت برق ہوتی ہے جس کی کشش سے الیکٹرون یعنی دوسرے ذرے اس کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ الیکٹرون میں منفی برق ہوگی۔

مادہ کی ساخت سے متعلق ان انکشافات کے بعد جو فکر اب تک اس کے متعلق رائج تھا وہ ایک بنیادی فکر کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب سائنس دان کائنات کی ساخت کی تشریح صرف اقلیدس کے ابعاد ثلاثہ یعنی طول اور عرض و عمق سے نہیں کر سکتے۔ اب ابعادِ اربعہ کا علم ہندسہ ایجاد ہو چکا ہے جیسے آئن سٹائن (Einstein) کے نظریہ اضافیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

اس نظریہ کو احصائے ٹینسر (Tensor Calculus) کے نہایت پیچیدہ اور دقیق عمل ریاضی کو سمجھنے کے باوجود عام فہم زبان میں سمجھانا مشکل ہے۔ بہر حال عام اذہان پر ان نظریوں کا اتنا اثر ضرور ہوا ہے کہ وہ اس ٹھوس دنیا کو اب ایسا نہیں سمجھتے جیسا کہ وہ سطحی طور پر نظر آتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح سائنس اور علم ہیئت (Astronomy) کے انکشافات میں جتنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کائنات کے تصور میں وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ اس تصور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے یہ سب انتشار ایک ہی ساعت اور ایک ہی نقطہ سے شروع ہوا ہوگا لیکن سائنس دان ہمیں یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؛ اور نیز یہ کہ اس کی ابتدائی کیفیت کیا تھی؛ بہر حال پیدائش عالم کا وہ مذہبی تصور جسے کن فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے اب سائنس اس سے نہیں ٹکراتی یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتی۔

سائنس کے افکار و نظریات عوام کی سمجھ سے بلند ہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی سے متعلق عام لوگوں کے تخیل پر ان چیزوں کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اگر سائنس مادیت پر اصرار کرے تو اس فلسفہ میں انسانی روح جیسی اہم چیز کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی لیکن اب جبکہ سائنس دانوں نے مادہ کو خود فنا کر دیا ہے اور ان کا رجحان زیادہ تر اس نظریہ کی طرف ہے کہ مادہ اور روح کا باہمی اتحاد ایک دوسرے کے ساتھ اندازی حیثیت کا ہے یعنی وہ ایک ہی شے کے دو مختلف مظاہر ہیں تو اس کا اثر عام لوگوں پر یہ ہو رہا ہے کہ اب وہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محض مادی خوشحالی ان کی مسرت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ کہ مادی زندگی کا خوشگوار ہونا زندگی کا اعلیٰ نصب العین بھی نہیں ہے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر باطنی مسرت حاصل کرنے، اپنی شخصیت کے ارتقا اور مادی قوتوں کے ساتھ روحانی قوتوں کو بھی ترقی دینے کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

علم طب یا ڈاکٹری نے بھی ہمارے جسم کے اعضاء اور ان کے وظائف و عوارض کی نسبت بہت کچھ معلومات فراہم کر کے اور قسم قسم کی دواؤں اور طریقہائے علاج کو دریافت کر کے ہمیں بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق صرف ہمارے جسم سے ہے اور کوئی شبہ نہیں

کہ جہاں تک جسمانی صحت کی نگہداشت اور اس کی حفاظت کا تعلق ہے یہ علم ہمارے لئے بیش از بیش فائدہ کا حامل ہے لیکن اس سے کسی عام انقلابِ ذہنی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے برخلاف فلاسفہ کے افکار و خیالات سوسائٹی کی ذہنیوں پر جواڑ ڈالتے ہیں وہ بہت گہرا اور دیر پا ہوتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ فلسفہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں ایک ایسی چیز کا تصور پیدا کرتا ہے جو موجود نہ ہو، لیکن اس کے باوجود وہی چیز ہمارے لئے حسن و قبح کا معیار بن جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم آئیڈیل (محصول) کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد ایک ایسا مکمل ذہنی تصور ہوتا ہے جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس تصور کو اصل قرار دے کر عملی زندگی میں اسی کی نقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ لفظ محصول افلاطون کے فلسفہ سے لیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر خارجی حقیقت کے لئے ایک عینی یا مثالی حقیقت کا وجود ضروری تھا جو عالم مثال میں پائی جائے۔

افلاطون کے برخلاف ارسطو شاہدہ کا قائل تھا۔ اس کی تلاش اور جستجو کا نصب العین صداقت اور حقیقت تھا۔ اس کے نزدیک درست، معقول اور مناسب وہی چیز ہو سکتی ہے جو سب کے لئے مفید ہو اور سب اس سے مسرت حاصل کر سکیں۔ ارسطو کے نزدیک اصلی مسرت کا لازماً اعتدال اور توازن قائم رکھنے میں یہاں ہے مثلاً فضول خرچی اور بخل کے درمیان کفایت شعاری حدِ اوسط ہے اور یہی اعتدال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو بہ نسبت افلاطون کے زیادہ حقیقت پسند اور حقیقت شناس تھا چنانچہ اس کی تعلیم کا اثر سکندر کے کارناموں سے ظاہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد نے استاد کے نظریہ اعتدال پر عمل نہیں کیا اسی وجہ سے سکندر کی زندگی میں متعدد مثالیں نہایت شدید بے اعتدالی کی ملتی ہیں اور عجب نہیں بے اعتدالیوں کے ہی باعث وہ ۳۳ سالہ زندگی کی قلیل مدت میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ ارسطو کے فلسفہ کا اثر یورپ کے دلغ پر بھی بہت کچھ ہوا ہے۔

ایک فلسفی کی اپنی زندگی میں اس کے فلسفہ کا اثر اس کے ماحول یا عوام پر بہت کم ظاہر

ہوتا ہے لیکن اس کی وفات کے بعد جب دنیا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کا فلسفہ رائج ہوتا ہے تو وہ انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے۔

روس کے چیدہ چیدہ خیالات نے اپنے زمانے میں وہ روح پھونکی جس کے زیر اثر انقلابِ فرانس نے جنم لیا اور انسانی قید کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ آزادی، مساوات اور اخوت و بہمدردی کے الفاظ اب بھی ہمارے کانوں میں گونج کر رہیں اس نصابِ لعین کے حاصل کرنے کے لئے ابھارتے رہتے ہیں چنانچہ انقلابِ فرانس کے بعد دوسری قوموں نے جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے سر اٹھایا اور آزادی حاصل کی۔ حقیقتاً امریکہ کی سول جنگِ غلامی کو دور کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔ ابراہیم لنکن کو صبحِ معنی میں فلسفی نہ تھا لیکن طرزِ حکومت کی جو بنیاد اس نے رکھی ہے اس کا چارواں گ عالم میں اب بھی ڈھکا بج رہا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں پر خود اس قوم کے افراد اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کریں۔

جیرمی بٹیم (Jeremy Bentham) اٹھارویں صدی کے انگریز مصنف نے فلسفہ

افادیت کی بنیاد رکھی یعنی یہ کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ مسرت پہنچانا ہمارا انتہائی مقصد ہونا چاہئے۔ اس نظریے نے اس زمانہ کی نسل پرگمراہی کو اڑا سنا اور آئندہ اصلاحات کی بنیاد پھر اسی نظریے پر رکھی گئی، جماعتی تفوق کا سدباب اس نظریے کا لازمی نتیجہ تھا۔ چنانچہ اب بھی اس کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ بات قابلِ محاظہ ہے کہ یہ نئے نئے پیش آمدہ خیالات دراصل ہمارے علم میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتے بلکہ ان کی حقیقت کا انجھار ان جذبات سے ہوتا ہے جو کانوں میں پڑنے سے ابھرتے ہیں۔ وہ زندگی کے مقصد کی کوئی مفصل تشریح نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے مقصد دریافت کرنے میں سگِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

زندگی کی حقیقت کی تلاش اور مقصدِ زندگی متعین کرنے میں ہمیں ایک اور ذریعہ سے بھی مدد پہنچ سکتی ہے۔ مذہب ہمارے سوالات کا جواب الہامی انداز میں دیتا ہے۔ سائنس خارجی دنیا میں جو کچھ اسے نظر آتا ہے اس کا تجزیہ کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ فلسفہ سائنس کے حقائق کی

روشنی میں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کر کے ہمارے سامنے کائنات کے حقائق اور ان کے نتائج پیش کرتا ہے۔ نفسیات ہم کو خود ہمارے متعلق کچھ بتاتی ہے اور ہمیں خود اپنی فطرت و ذہنی ساخت سے آگاہ کر کے ہماری زندگی کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

نفسیات | ایک عرصہ تک ماہرینِ نفسیات بھی فلسفیوں کی طرح اپنے ماحول سے کچھ بے تعلق سے رہے۔ اس عرصہ میں ان کا مقصد جستجو یہی رہا کہ آیا انسان میں روح ہے یا نہیں۔ اور اگر روح ہے تو اس کا انسانی جسم سے کس قسم کا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں جدید انکشافات کے ذریعہ انھیں معلوم ہوا کہ انسان میں روح ہے اور اس کے وظائف سے ہم آگاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ سائنٹفک طریقہ تحقیق اختیار کرنے کے بعد علمِ نفسیات کے دائرے میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے موجودہ زمانے میں انقلاب برپا کر دیا۔ گوان کی تلاش و جستجو ابھی بہت کچھ تشنہِ تمام ہے پھر بھی جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں ان سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے۔ ان معلومات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ انھوں نے انسانی کردار کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور اس متعلق بہت کچھ معلومات جمع کیں۔ مثلاً یہ کہ انسانی کردار کا منبع کیا ہے، فہم و ادراک کا ارتقا کس نہج پر ہوتا ہے۔ ایک انسان کی قوتِ ادراک میں کیا کیا عنصر شامل ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جسم اور نفس کا آپس میں ایک دوسرے پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے یعنی جسم کا نفسِ انسانی اور کیکٹر پر کیا اثر ہوتا ہے اور نفس کا جسم پر کیا اثر ہے۔

نفسیات کے عالموں کی جستجو کا عام نتیجہ جو برآمد ہوا یہ ہے کہ ہم کو اس کے ذریعہ خود اپنے ہی کو سمجھنے میں نہیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ یہ علم کہ ہمارے اعمال و افعال شعوری اور لاشعوری دونوں کیفیتوں کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ نفسیات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے اخلاق کی بنیاد بچپن میں ہی پڑ جاتی ہے۔ وہ اثرات اور کیفیات جو بچپن میں جرم ذہن بن جاتی ہیں ان کا اثر تمام عمر باقی رہتا ہے۔ ملور یہ اثرات اور کیفیات ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر محفوظ رہتی ہیں اور پھر آئندہ زندگی میں ہمارے افعال پر متواتر اثر انداز ہوتی رہی ہیں اور ہم اس کے اثر سے

بعض اشخاص میں ہر چیز کے جمع کرنے یا اٹھالینے کی بری عادت ہوتی ہے۔ انہیں ایشیا کے جمع کرنے میں جو طریقہ بھی اختیار کرنا پڑے وہ اس کے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ بعض اوقات جو ایشیا وہ چوری کرتے ہیں کوئی قیمتی یا ایسی نہیں ہوتیں جن کی ان کو حقیقتاً ضرورت ہو، ایسی بری خصلتوں میں بعض اچھے اور دو ٹوند گھرانوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس عیب کے علاوہ ان کے کیریکٹرس اور کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ پہلے ایسے اشخاص کو چوری کا مجرم سمجھا جاتا تھا بلکہ سو سال پہلے شاید ایسے آدمی کو سخت سزا دی جاتی ہو، لیکن آج ہم اس کے اس جرم کو اس کے ذہن میں ایک خاص نقص یا کمزوری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے بجائے سزا دینے کے اس کے علاج کا فکر کرتے ہیں۔

یہ لیک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تعزیرات کی اصلاحات جو آج کل ہو رہی ہیں وہ فقط انسانی محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت نہیں کی جا رہی ہیں بلکہ وہ انسانی کردار کی ماہیت و فطرت کے متعلق باقاعدہ علم کے مرتب ہو جانے کا ایک لازمی نتیجہ ہیں۔ اگر کسی ایسے شخص سے جس کا دماغ خراب ہو، کوئی ہلک جرم سرزد ہو جائے تو ہم اسے اس جرم کی اصلی سزا کا مستحق نہیں سمجھتے بلکہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

طبعی کردار ہم اسے سمجھتے ہیں جو ایک صحت مند، صحیح تربیت یافتہ انسان میں طبعی جبلت و فطری جذبات کی روشنی میں رونما ہو۔ ایک شخص بہت سی خلقی اور پیدائشی صفات اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن انسانی کیریکٹرس بہت سے ایسے عنصر موجود ہوتے ہیں جو عام توقع کے خلاف اکتاب کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخلاق کا مطالعہ کرے۔ علم نفسیات میں ایک خاص باب بچپن اور شباب کے زمانہ کے مسائل پر بحث کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ عنفوانِ شباب سے مراد مردوں کے لئے عمر کا وہ حصہ ہے جو ۱۴ سال سے پچیس سال تک کا ہوتا ہے اور عورتوں کے لئے ۱۲ سال سے ۲۱ سال تک کا۔ اس باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی فرد کے ذاتی اعمال میں عنفوانِ شباب کے ارتقائی زمانہ کو کتنا دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھانے کی

کوشش کی گئی ہے کہ آئندہ زندگی کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے ایک بچے کی تربیت کن اصول کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہئے۔ ان نفسیاتی تحقیقات کے ذریعہ ہم اپنی اور آئندہ نسلوں کی زندگی سدھانے میں کافی مدد لے سکتے ہیں۔

گو ماہرینِ نفسیات طبعی کردار اور حقیقی کیریئر کے متعلق ہمیں کوئی کامل معیار مقرر کر کے نہیں دیکتے پھر بھی مجموعی طور پر وہ اتنا بتلا سکتے ہیں کہ فطرت صحیح توازن قائم رکھنے اور کشاکش سے معرعات کا نام ہے۔ علمِ نفسیات دیکھا جائے تو ہمارے لئے ایک امید افزا پیغام ہے، ہماری زندگی کی فلاح و بہبود اور خوشی اور مسرت حاصل کرنے میں ماہرینِ نفسیات ہماری بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں یعنی وہ ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہم اپنے کیریئر کی خرابیوں کو خود سمجھ کر انہیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض اوقات یہ خرابیاں چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ماہرِ نفسیات تحلیلِ نفسی کے ذریعہ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا یہ خرابیاں چھوٹی ہیں اور چشم پوشی کے قابل ہیں، یا کوئی مہلک صورت اختیار کر سکتی ہیں یا کر چکی ہیں۔ غرض کہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے لئے نفسیات نے ہمارے لئے نئے نئے راستے پیدا کر دیئے ہیں۔

پیشے کے انتخاب میں بھی نفسیات ہماری رہنمائی کر سکتی ہے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سا پیشہ ہمارے لئے مناسب ہو گا یعنی یہ کہ ہم کس قسم کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر کسی کام میں کیا نیت ہو یعنی صبح سے شام تک متواتر ایک ہی قسم کا کام انجام دینا ہو تو نفسیات ایسی صورت میں ہمیں تکامل دور کرنے کے طریقے بتا سکتی ہے۔ مکان میں تخفیف ہو جانے سے ہمیں ان کاموں میں جو نہایت خطرناک قسم کے ہوتے ہیں بڑی مدد ملتی ہے۔ نفسیات کے اس شعبہ کا نام صنعتی نفسیات ہے۔ یہ شعبہ اس امر کی تحقیق کرتا ہے کہ انسان کے لئے اس کام کی ایک خاص رفتار کتنے عرصے تک قائم رکھی جاسکتی ہے اور کام کرنے والا کتنے عرصے تک اپنی پوری توجہ اس کام کی طرف قائم رکھ سکتا ہے۔ نفسیات کی اس تحقیق سے مزدور اور مالک کا رضائے دونوں کا کام بخوبی ہو جاتا ہے۔ مالک کا کام بہتر ہونے لگتا ہے اور مزدور کو کام اس کے حالات اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے، مزدور کے مناسب آرام اور ضرورت

کا خیال رکھنے سے وہ خوشی خوشی کام بھی بہت کر لیتا ہے۔

اسی طرح نفسیات ہماری خرابیاں دور کرنے میں مدد کرتی ہے، وہ خرابیاں خواہ مہلک قسم کی ہوں یا معمولی قسم کی، ان کے دور کرنے کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فی الواقع ان خرابیوں کا ماخذ کیا ہے؟ ان کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہے؟ یہ معلوم ہونے کے بعد اس خرابی کا دور کرنا زیادہ مشکل نہیں رہتا اس عمل کا نام تحلیل نفسی (Psycho-analysis) ہے۔ نفسیاتی خرابیوں اور مشکلات کا منبع معلوم ہونے کے بعد ان کے دور کرنے کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر بہولت دور پڑتی ہیں مثلاً فرض کیجئے ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے جس پر شرم و حیا اس درجہ غالب ہے کہ وہ اپنی بے تکلف ہجولیوں میں بھی چپ چاپ اور خاموش رہتی ہے وہ جن لوگوں سے ملنا چاہتی اور ان کو غم اور خوشی میں اپنا شریک بنانا چاہتی ہے ان سے بھی بات کرتی ہے تو بڑی جھینپی ہوتی ہو کر ایسی لڑکی کو اگر ایک ماہر نفسیات دیکھے گا تو وہ یہ تجویز کرے گا کہ اس لڑکی میں احساس کتری (inferiority Complex) بدرجہ غایت موجود ہے۔ بچپن میں اس کے والدین نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی چونکہ وہ لڑکی سادہ مزاج تھی اور اسے صرف اپنے سے زیادہ عمر کے بچوں میں رہنے کا موقع ملا تھا اور وہ بچے اپنے احساس برتری کی وجہ سے اسے بڑی بے دردی سے تاتے رہتے تھے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی میں لاشعوری طور پر اپنی کتری کا احساس راسخ ہو گیا اور وہ سب کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حقیر و کمتر محسوس کرنے لگی۔

ایسے واقعات روزانہ ہمارے تجربے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ماہر نفسیات اس خرابی کو معلوم کر لیتا ہے اور وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ یہ خرابی کونکر پیدا ہوئی۔ خرابی اور اس کا سبب معلوم ہونے سے نصف مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اخبار میں ایک لڑکی جس کی عمر ۱۷ سال تھی خودکشی کرنے کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن اسے پانی میں ڈوبتے ڈوبتے پچالیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا کہ ایک پرچہ میں جو اس نے خودکشی سے پہلے اپنی ماں کے نام لکھا تھا کہ چونکہ تمام لوگ اس کے مخالف ہیں اس لئے وہ اس

دنیا میں اور زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔“

اس لڑکی پر جب خودکشی کا مقدمہ دائر ہوا تو اس نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کے اپنے بہن بھائیوں سے تعلقات تو شگوار نہیں تھے اس لئے وہ اس دنیا کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کا طبی معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسے کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے اور اسے صرف معالجہ نفس کی ضرورت ہے چنانچہ ماہر نفسیات کی یہ تشخیص تھی کہ کچھ عرصہ سے اس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا اور زندگی اسے بالکل بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔

درحقیقت بچپن اور عرفوانِ شباب کے زمانہ میں بعض واقعات اور ماحول کی بنا پر ہمارے ذہن میں جذبات کی کچھ ایسی گریں لگ جاتی ہیں کہ پھر وہ تمام عمر نہیں کھلتیں۔ یہ گریہ اندر ہی اندر اندر آشوری طور پر ہماری زندگی کو دھوا رہا بنا دیتی ہے۔ یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہم اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی بہت کچھ درست کر سکتے ہیں۔ ماہرین نفسیات نے زندگی کے حقائق کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے اندرونی امراض کے ایسے اسباب و علالات بیان کئے ہیں جن پر ہمارا دور کا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان انکشافات کے سمجھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو اور دوسروں کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کا کوئی کامیاب مقصد بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ذہنی اور جسمانی ہر دو اعتبار سے ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یقیناً ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی صحت کے درست ہونے کو کون برا کہہ سکتا ہے جب تک دماغ اور جسم درست نہ ہوں گے زندگی کے حقیقی مقصد سے ہم بہت دور رہیں گے۔

انسانی اعمال و اخلاق کی خامیاں دور کرنے اور ذہن و دماغ پر قابو پالینے کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ علم نفسیات نے جسم اور روح کے آپس کے تعلقات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے یعنی یہ کہ نفس کا اثر روح کے لئے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اسی طرح روحانی امراض کا صدرمہ جسم کے لئے مضرت ثابت ہوتا ہے اب تجویز یہ ہے کہ نفسیات اور تحلیل نفسی ڈاکٹری یا طب کے نصاب میں لازمی مضامین کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں۔

اس سلسلے میں غدد کے متعلق علم طب کا جدید نظریہ قابلِ غور ہے۔ ان غددوں سے

جنہیں ہم محض بے کار سمجھتے تھے جدید معلومات کے مطابق ایسی رطوبات خارج ہوتی ہیں جن کا ہمارے جسمانی نشوونما سے گہرا تعلق ہے مثلاً درقیرہ (acid mucus) غدود کی خرابی کا نتیجہ جسمانی اور روحانی دونوں صورتوں کی خرابی میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض طبی مرض اپنے آپ کو مریض خیال کرتے ہیں۔ ظاہری علامات سے ان کی بیماری ظاہر بھی ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ان کی بیماری کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ نفسیاتی یا دماغی کیفیت کی خرابی سے ہوتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ مثال قابل ذکر ہے اس سے آپ کو جسم پر لا شعوری نفسیاتی کیفیت کا اثر ظاہر ہو جائے گا۔ ۱۹۱۷ء کی جنگ عظیم کے دوران میں ایک سپاہی کا بازو اٹھل ہو گیا۔ چنانچہ اسے لڑائی سے واپس بلا لیا گیا۔ طبی ماہرین اور ڈاکٹروں کے بعد اس بات سے مطمئن تھے کہ واقعہ وہ اپنے بازو کو حرکت نہیں دیکھتا۔ اس کے برخلاف ماہرین نفسیات کو اس بات کا یقین تھا کہ لڑائی کے میدان سے الگ ہونے کے لئے اس کے لا شعوری نفس نے یہ جیلہ اختیار کیا تھا۔ حقیقتاً اس کے بازو کے اعصاب و پٹھے بیکار نہیں ہو گئے تھے بلکہ لا شعوری نفس کا اس کے جسم پر پورا کنٹرول تھا اور خود سپاہی کو اس گرفت کی خبر نہ تھی۔

اسی طرح نفس پر جسم کے کنٹرول کی مثال بھی آسانی سے دی جاسکتی ہے چنانچہ جسم کا کوئی عیب یا نقص کا اثر انسان کی نفسیات اور اخلاق پر بہت گہرا پڑتا ہے اگرچہ یہ اثر لازمی نہیں ہے مثلاً تیموننگڈا تھا۔ راجہ رنجیت کی صرف ایک آنکھ تھی۔ جگہ بہت ممکن ہے کہ اس عیب ہی کا ان کے کردار کو نمایاں اور کامیاب بنانے میں حصہ ہو۔ بعض انسان جسمانی نقائص پر غلبہ پالیتے ہیں، امریکہ کے سابق پریزیڈنٹ روز ویلٹ پر جوانی میں فالج گرا تھا لیکن اس مرض کا ان کے کیریئر یا کردار پر کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ بہت سے شاعر اور ادیب آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود شعر و ادب میں کمال رکھتے ہیں۔

ابھی نفسیات کے ماہرین کا کام مکمل نہیں ہوا ہے لیکن جتنا کچھ ہوا ہے وہ بہت ہے یہاں ہمارا مقصد نفسیات کے کام کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نفسیات زندگی کے معنی

مقصد سمجھنے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہے۔ نفسیات ہمیں اپنے آپ کو، اپنے اخلاق، اپنی خصلت اپنے جذبات، اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نفسیات کے ذریعہ اپنی شخصیت کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم میں کیا کیا خوبیاں موجود ہیں اور ہم میں کس قسم کی کتنی صلاحیت ہے۔ جب ہم کوئی غلطی کرتے ہیں تو نفسیات ہمیں اس غلطی سے آگاہ کر دیتی ہے، اور ان خامیوں کے دور کرنے میں مدد و معاون بنتی ہے۔ بہر حال زندگی کا کوئی بھی مقصد ہو اس کے لئے نفسیات کی امداد از حد ناگزیر ہے۔

نذہب، سائنس، فلسفہ اور نفسیات کے علاوہ عوام الناس کی رائے کو بھی زندگی کے مقصد متعین کرنے میں کافی دخل ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر رائے عامہ کی طاقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جمہوریت کے دور دورے میں رائے عامہ بھی ان طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے جس کا زندگی پکوانی اثر ہوتا ہے۔

زندگی کی حقیقت وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جو فہم و ذکاوت سے کام لیتا ہے اگرچہ حقیقت و مقصد جزوی ہی کیوں نہ ہوں۔ قسمت کو اپنا مخالف سمجھ بیٹھنا ہمیں صحیح فیصلہ کرنے سے باز رکھتا ہے، دنیا کو بری جگہ یا اپنا دشمن تصور کرنے سے ہم زندگی کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتے اور نہ اس کے صحیح مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

عام طور پر انسان روح کو جسم سے افضل تصور کرتا ہے لیکن وہ یہ بھی بخوبی سمجھتا ہے کہ روح کا اظہار جسم ہی سے ہوتا ہے۔ گویا زندگی میں نفس کو جسم پر اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ زندگی کی ظاہری یا خارجی شکل حل کرنے سے پہلے نفس اور روح کا عقدہ حل کرنا لازم ہے۔ مادی اور روحانی قوتوں میں کامل اتحاد و اشتراک پیدا کرنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ اول تو اس وجہ سے کہ تناسب و اعتدال ہی انہی جگہ باعث مسرت و راحت ہے اس کے علاوہ کامیابی اور استكمال نفس و روح کا یہی ایک راستہ ہے۔ استكمال نفس سے مراد وہ روحانی سکون ہے جسے مادی ملکیت یا مفاد کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے لیکن مادی مفاد اور روحانی سکون میں امتیاز آسانی سے نہیں ہو سکتا۔

مندرجہ بالا نتائج کی روشنی میں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کام یا عمل زندگی کا بہترین مقصد ہے لیکن کام اسی صورت میں اچھا مقصد ثابت ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے فرائض کو فخر و مسرت سے انجام دیں۔ ایسے کام کرنے والے کو ایک روحانی سکون حاصل ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کا آئندہ طور پر بسر ہو رہی ہے اس کی بجائے وہ شخص جو محض لالچ یا فائدے کی خاطر کام کرتا ہے اس کا کام کسی تعریف کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا شخص اخلاقی حیثیت سے قابلِ رحم ہے۔

کام کے علاوہ طاقت حاصل کرنے کی خواہش بھی زندگی کا ایک مقصد بن سکتی ہے یہ خواہش عام ہے اور تقریباً ہر انسان میں کم و بیش پائی جاتی ہے یہاں تک کہ کسی شخص میں اس خواہش کا فقدان قابلِ حیرت ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہی خواہش مختلف صورتوں میں کارفرما نظر آئے گی۔ خواہ وہ سیاسی طاقت کی خواہش ہو یا دولت کی۔ خواہ وہ معاشرتی طاقت ہو یا فوجی طاقت۔ بہر حال یہ خواہش طاقت کے مختلف ذرائع کے حاصل کرنے سے متعلق ہوتی ہے۔ اس طاقت کے صحیح یا غلط استعمال ہی میں انسانی کیہر کیہر کا سب سے بڑا امتحان مضمر ہے۔

مثلاً کسی شخص کو کسی پیشے میں خاص جہارت حاصل ہونے سے جو طاقت میسر آتی ہے وہ بھی اس کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ دنیا اس طاقت کو بغیر امتحان دیکھتی ہے اور یہ طاقت اس طاقت سے بہتر ہے جو زبردستی حاصل کی جائے۔

آج کل زندگی بسر کرنے کے لئے مختلف مقاصد کا انتخاب کیا جا سکتا ہے مثلاً آرٹ، طلب علم، لیڈری، خدمتِ خلق، بیرونی مباحث، فلسفہ و سائنس، تصنیف و تالیف، ملازمت، غرض یہ اور اس کے ما سوا تمام اور کام ہر شخص کی طبیعت و افتاد کے مطابق الگ الگ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس میں سے ہر کام کے لئے اس کے کرنے والے میں جو ضروری خصوصیات یا خوبیاں ہونی چاہئیں ہونی لازمی ہیں۔ غرض جو کام بھی کیا جائے اس میں بہتر سے بہتر طریقہ پر فرائض کی انجام دہی کو ملحوظ رکھا جائے اس میں کسی لالچ یا حرص کو دخل نہ ہو۔ ایسی صورت میں کام کرنے والے

کے قلب کو یقیناً سکون حاصل رہے گا اور وہ خوش رہے گا۔ اسی طرح ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اس کا مقصد زندگی صحیح ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اسے اپنی قوتیں صحیح راہ پر لگانا چاہئیں پھر وہ جتنا اپنا مقصد زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی اسے راحت و سکون حاصل ہوتا رہے گا۔ جو مقصد اپنی قابلیت و صلاحیت اور ماحول کا اندازہ لگا کر متعین کیا جائے اور بتدریج اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے وہی بہترین مقصد زندگی ثابت ہو سکتا ہے، اور اسی سے اطمینانِ قلب بھی نصیب ہو سکتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے خود کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسروں کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

کیونکہ دوسروں کو سمجھے بغیر ہم ان کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ دوسروں کو سمجھنے کے لئے بھی پہلے اپنے کو سمجھنا ضروری ہے۔ کسی حادثے کے وقت اگر ہم اپنی رنج کی کیفیت سے واقف ہوں گے تب ہی ہم دوسروں کے رنج کا احساس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر موقع پر جب ہم اپنے سے سوال کریں کہ میں ایسے موقع پر کیا محسوس کرتا، یا کیا عمل کرتا۔ تب ہی ہم دوسروں سے اس عمل یا احساس کی توقع کر سکتے ہیں۔ اسی لئے مذہب بھی ہمیں ہی بتاتا ہے کہ ہم دوسرے انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خدا کو بھی جب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم اپنے آپ کو سمجھیں۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه۔

آج کل اپنے کو جاننے کے لئے بھی ایک سائنٹفک علم اور عمل ہے لہذا ہمیں اپنے نفس کا تجزیہ قاعدے اور اصول کے ماتحت کرنا چاہئے۔ یہ قاعدے اور اصول یکساں طور پر ہر شخص کے لئے مقرر نہیں کئے جاسکتے بلکہ آپ اپنے نفس کے سامنے دیانتداری کے ساتھ اپنے متعلق سوچئے۔ ذاتی خوبیوں اور عیوب کا علم کسی اور کو ہو یا نہ ہو آپ کو خود ان کا علم ہونا ضروری ہے۔

مثلاً آپ پہلے اپنی جسمانی خصوصیات کا جائزہ لیں پھر اپنی ذہنی قابلیتوں کی جانچ کریں، اپنے جذبات کی کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اپنے بچپن کے واقعات اور اپنی سوسائٹی اور اس کے رجحانات کو مد نظر رکھیں۔ اخلاقیات کے متعلق اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جماعتی میل جول میں اپنی کامیابی و ناکامیوں پر غور کریں پھر یہ دیکھیں کہ آپ کیا گیا ہر جانتے ہیں جو ہر جانتے ہیں وہ سطحی

طور پر جانتے ہیں یا واقعی ان کا آپ کو معتبر علم ہے اور اگر ابھی کمال حاصل نہیں ہوا تو اس کے حاصل کرنے میں آپ کتنی کوشش صرف کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ زندگی آپ کے نزدیک کس نہج پر بسر ہونی چاہئے۔

لیکن بعض اوقات انسان اپنے متعلق سوچتا ہے اور کافی سوچنے کے بعد بھی وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا اور نہ اسے قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جب یہ صورت ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے کو ابھی نہیں سمجھا۔ اپنے آپ کو سمجھنا آسان نہیں ہے بعض اوقات اپنے متعلق متواتر غور کرنے اور اپنے حقیقی دوستوں کی اپنے متعلق رائے سننے کے بعد ہم اپنے آپ کو سمجھ پاتے ہیں۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ گویا آپ نے اپنے کو پہلے کبھی اس روشنی میں نہیں دیکھا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے متعلق بہت زیادہ سوچنا یا غور کرنا بھی مضر ہے۔ حد سے تجاوز کرنا ہر صورت میں نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ہمارے بہت سے فطری جذبات پر بے جا دباؤ پڑے گا جس کی وجہ سے صحیح راستہ سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ جذبات آقا ہیں اور دماغ ذہن ان کا مطیع ہے۔ اس کے علاوہ اپنے متعلق صحیح کام انتخاب کرنے میں یا مقصد زندگی کی تلاش میں آپ کا ضمیر بھی آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ ایک تپ دق کے بیمار کی زندگی اگر اس کی مرضی کے مطابق بسر ہونے لگے اور اس کے جذبات کا اظہار بغیر کسی روک ٹوک کے ہو سکے تو یقیناً اس کی تپ دق دور ہو جائے گی اور وہ صحیح اور طبعی زندگی بسر کرنے لگیگا۔ ہمارا کام زندہ رہنا اور کام کرنا ہے۔ ہر شخص خود اپنے متعلق دو سوچوں سے بہتر اور صحیح علم رکھتا ہے۔ آغاز و انجام ایسی چیزیں ہیں جن کا علم ہمیں نہیں ہے نہ دنیا کے آغاز و انجام کے متعلق ہمیں علم ہے اور نہ اپنے ہی متعلق کچھ اطلاع ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہم اپنے آغاز و انجام سے بے خبر ہیں اور اس زندگی کی ہم کو سر کرنے میں مصروف کار ہیں۔ حصول مقصد کی بہ نسبت حصول مقصد کی سعی اور اس کا زمانہ زیادہ دلچسپ اور مسرت آمیز ہوتا ہے اگر مقصد ہی مقصد ہماری گردن پر سوار ہے تو اس کا نتیجہ سوائے مصیبت اور گھبراہٹ کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ تاریخ بھی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ کسی ہم کام سر کرنا انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے۔

روح افزا ہے۔ نامکن کو ممکن بنانے میں زندگی کی ستریں پوشیدہ ہیں۔

لیکن ان لوگوں کا کیا ہو سکتا ہے جن کے لئے زندگی میں کوئی دلکشی ہی نہیں اور جو صبح کو روزِ بد کا آغاز تصور کرتے ہیں۔

ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں ہے تب بھی آپ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور قرار دیں بشرطیکہ آپ کو اس کا طریقہ معلوم ہو، سب سے پہلا قدم اس سلسلے میں یہ ہونا چاہئے کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی صاف و صریح مقصد مقرر کریں اور پھر غور کریں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ کیا عمل کر سکتے ہیں۔ آیا وہ عمل اس کے وصول کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ پھر یہ دیکھئے کہ آپ کے اس عمل سے وہ مقصد جو آپ کے تخیل میں موجود ہے کس حد تک پورا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کیا واقعی اپنی زندگی اس ارادے کی تکمیل کے لئے بسر کر رہے ہیں یا نہیں اگر آپ کی زندگی کا روزانہ عمل آپ کے اطمینانِ قلب کے لئے کافی نہ ہو تو آپ کو نئے راستے سوچنے پڑیں گے اور اس کے مطابق اپنے عمل کو بھی بدلتا پڑے گا اور اس میں کچھ تفریحِ طبع کے سامان بھی بہم پہنچائے جاسکتے ہیں اور روزانہ کام کے علاوہ کوئی تفریحی مشغلہ بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

زندگی کا مقصد متعین کرنے کے لئے ایک اور قدم بھی اٹھایا جاسکتا ہے جو اب تک

یورپ و ایشیا بلکہ تمام دنیا میں یکساں طور پر کامیاب ثابت ہوا ہے اور وہ خدمتِ خلق سہ ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اصول زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ سوداگری جیسے خالص دولت اکٹھا کرنے کے پیشے میں بھی وہی سوداگر زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو اپنے گاہکوں کی سب سے اچھی اور بہتر خدمت کرتا ہے۔ اسی اصول کے مد نظر مختلف کمپنیاں اپنے سروس اسٹیشن (Service

Station) قائم کرتی ہیں اور اس طرح اپنے گاہکوں کے حلقے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں

اگر ہم صبح ایک شخص کو خوش کرنے کا تہیہ کر لیں تو سال میں تین سو پینسٹھ انسانوں کو خوش کر سکیں گے

جرمنی کا فلسفی شاعر (Goethe) کہتا ہے کہ زندہ رہنے کا کمال یا آرٹ یہ ہے کہ ہم زندہ رہنے

کے لئے اپنا وجود اپنی ذات متحج دیں۔ یہ اصول اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ انسان دوسروں

کے لئے ذاتیات ترک کر کے ان کی خدمت کے لئے مستعد ہو جائے۔ دراصل اسی اصول کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بنا ہے۔ یہی اصول تمام علوم، سائنس، تمدن و تاریخ اور مذہب کے کارناموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انسانی زندگی کا اس سے زیادہ افضل اور اشرف اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس مقدمہ میں وہ طاقت اور وہ اثر پوشیدہ ہے جو مستقل طور پر انسانوں کے لئے مشعل ہدایت بنا رہا ہے اور آئندہ بھی بنا رہے گا۔ اسی اصول پر ہمارے پیغمبر و مہمرب خود عمل کر کے بنی نوع انسان کے لئے ایک صحیح راستہ چھوڑ گئے ہیں جس پر چل کر انسان خود اپنے لئے اور بنی نوع انسان کے لئے مسرت اور فلاح و بہبود حاصل کر سکتا ہے۔

فیض الباری

مطبوعہ مصر

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کی مشہور ترین اور مایہ ناز کتاب ہے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب، قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یا یادگار ہے جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دل کشی کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے۔

فیض الباری کی حیثیت علامہ مرحوم کے درس بخاری شریف کے امالی کی ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدر عالم صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت، دیدہ ریزی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے علاوہ فاضل مولف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے

مکمل چار جلدوں کی قیمت سولہ روپے

نیچر کتب خانہ برہان دہلی قرول باغ